Volume 04, Issue 01,
January-March 2026
PP: 186-195
Open Access on:
www.alimanjournal.com

AL-IMAN Research Journal
P-ISSN: 3006-1261 E-ISSN: 3006-127X
https://doi.org/10.63283/IRJ.04.01/10

Article QR

اردو کی نسائی تنقیدی روایت اور سعادت حسن منٹو: ایک تجزیاتی مطالعہ

The Feminine Critical Tradition in Urdu and Saadat Hasan Manto: An Analytical Study

Gulzar Ahmad[1], Dr. Shahid Hussain[2], Dr. Muhammad Yousaf[3]

Article History

Received
11-03-2026

Accepted
29-03-2026

Published
31-03-2026

Abstract & Indexing

Abstract

Saadat Hasan Manto remains a cornerstone of Urdu literature, yet his work has historically been a battlefield of moral and aesthetic controversies. This research article, titled ***"The Feminine Critical Tradition and Saadat Hasan Manto an Analytical Study,"*** *explores the profound role of female critics and writers in deciphering, defending, and re-evaluating Manto's literary legacy. While Manto was often marginalized by contemporary male critics under the guise of obscenity and negativity, the feminine critical tradition provided a more nuanced and objective lens to understand his art. The study examines the contributions of various female intellectuals ranging from the intimate reflections of Ismat Chughtai and the scholarly comparative analysis of Mumtaz Shirin to the modern socio-historical and stylistic perspectives of Ayesha Jalal, Tahira Iqbal, and others. The research highlights how these writers transcended superficial moral judgments to uncover the psychological depth, gender consciousness, and humanistic fervor in Manto's narratives. It particularly focuses on Manto's portrayal of women moving beyond the patriarchal stereotypes of the era and his role as an unwavering historical witness to the trauma of the 1947 Partition. By analyzing Manto's stylistic evolution and his thematic boldness through a feminine prism, this article concludes that the female perspective has been instrumental in reclaiming Manto's status as a universal humanist. The findings suggest that Manto's literary survival and his continued relevance in contemporary discourse are deeply indebted to the intellectual rigor and empathetic understanding provided by the feminine critical tradition in Urdu literature.*

Keywords:

Saadat Hasan Manto, Feminine Criticism, Urdu Fiction, Gender Consciousness, Partition Literature, Realism, Stylistic Evolution.

[1] *M.Phil. Urdu Scholar, Department of Urdu & Iqbaliat, The Islamia University of Bahawalpur, Rahim Yar Khan Campus, Pakistan* sirgulzar55@gmail.com ***Corresponding Author**
[2]*Department of Urdu & Iqbaliat, The Islamia University of Bahawalpur, Rahim Yar Khan Campus, Pakistan.*
[3]*Department of Urdu & Iqbaliat, The Islamia University of Bahawalpur, Rahim Yar Khan Campus, Pakistan.*

All Rights Reserved © 2026 This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

ملخص :

سعادت حسن منٹو اردو ادب کے ایک ایسے سنگِ میل ہیں جن کی تخلیقات تاریخی طور پر اخلاقی اور جمالیاتی تنازعات کا مرکز رہی ہیں۔ یہ تحقیقی مقالہ، بعنوان "اردو کی نسائی تنقیدی روایت اور سعادت حسن منٹو: ایک تجزیاتی مطالعہ"، منٹو کی ادبی میراث کی تشریح، دفاع اور بازیافت میں خواتین ناقدین اور لکھاریوں کے کلیدی کردار کا احاطہ کرتا ہے۔ جہاں منٹو کے ہم عصر مرد ناقدین نے فحاشی اور منفیت کے پردے میں اکثر ان کے فن کو حاشیے پر رکھا، وہاں نسائی تنقیدی روایت نے ان کے فن کی تفہیم کے لیے ایک زیادہ باریک بین اور معروضی زاویہ فراہم کیا۔ یہ مطالعہ مختلف خواتین دانشوروں کی علمی خدمات کا جائزہ لیتا ہے، جس میں عصمت چغتائی کے ذاتی و فکری مشاہدات اور ممتاز شیریں کے عالمانہ تقابلی تجزیے سے لے کر عائشہ جلال، طاہرہ اقبال اور دیگر معاصرین کے جدید سماجی، تاریخی اور اسلوبیاتی تناظر شامل ہیں۔ یہ تحقیق اس بات کو اجاگر کرتی ہے کہ کس طرح ان مصنفین نے سطحی اخلاقی فیصلوں سے بالاتر ہو کر منٹو کے بیانیے میں موجود نفسیاتی گہرائی، صنفی شعور اور انسانیت پسندی کے جذبے کو دریافت کیا۔ مقالہ خاص طور پر منٹو کی نسائی کردار نگاری—جو اس عہد کے پدرانہ دقیانوسی تصورات سے ماورا تھی—اور 1947ء کی تقسیم کے صدمات پر ان کی غیر متزلزل تاریخی گواہی پر توجہ مرکوز کرتا ہے۔ منٹو کے اسلوبیاتی ارتقاء اور ان کی موضوعاتی جرات مندی کو نسائی نقطۂ نظر سے پرکھتے ہوئے، یہ مقالہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ خواتین ناقدین نے منٹو کو ایک آفاقی انسان دوست فنکار کے طور پر دوبارہ متعارف کروانے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ نتائج ظاہر کرتے ہیں کہ منٹو کی ادبی بقا اور عصری مباحث میں ان کی مسلسل معنویت، اردو ادب کی نسائی تنقیدی روایت کی علمی جدوجہد اور ہمدردانہ تفہیم کی مرہونِ منت ہے۔

کلیدی الفاظ : سعادت حسن منٹو، نسائی تنقید، اردو افسانہ، صنفی شعور، ادبِ تقسیم، حقیقت نگاری، اسلوبیاتی ارتقاء۔

اردو افسانوی ادب کی تاریخ میں سعادت حسن منٹو (1912ء–1955ء) ایک ایسی ہمہ گیر شخصیت ہیں جن کے ذکر کے بغیر برصغیر کے ادبی بیانیہ کا مطالعہ تشنہ رہتا ہے۔ منٹو محض ایک افسانہ نگار نہیں تھے بلکہ وہ انسانی نفسیات کے نباض اور اپنے عہد کے ان سماجی و سیاسی تضادات کے نوحہ گر تھے جنہیں معاشرے کے مروّجہ اخلاقی ڈھانچوں نے پس پشت ڈال دیا تھا۔ سمرالہ (پنجاب) کی مٹی سے جنم لینے والے اس فنکار نے بیسویں صدی کی چوتھی اور پانچویں دہائی میں اپنی تخلیقی جولانیوں سے اردو ادب کو ان تلخ حقیقتوں سے روشناس کرایا جو اس سے قبل شجرِ ممنوعہ تصور کی جاتی تھیں۔ منٹو کا فن اپنی جڑوں میں اس بے باک حقیقت نگاری سے پیوست ہے جہاں وہ غربت، تشدد، سماجی ناانصافی اور انسانی جبلتوں کی عریانی کو کسی لگی لپٹی کے بغیر پیش کرتے ہیں۔ ان کے ہاں روزمرہ زندگی کی تصویر کشی میں ایک ایسی تڑپ اور جوش پایا جاتا ہے جو قاری کو محض حظ فراہم کرنے کے بجائے اسے داخلی اور خارجی بحرانوں پر سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنسیت، عصمت فروشی اور مے نوشی جیسے موضوعات ان کے ہاں محض موضوع برائے موضوع نہیں رہتے بلکہ سماجی جبر کے خلاف ایک احتجاجی استعارہ بن کر اُبھرتے ہیں۔

منٹو کی اس تخلیقی انفرادیت اور بے باکانہ اسلوب نے جہاں انہیں جنوبی ایشیا کے سب سے ممتاز ادیبوں میں شامل کیا، وہیں وہ اپنے دور کے سب سے زیادہ متنازعہ قلم کار بھی قرار پائے۔ ان کی حقیقت نگاری کو اکثر نام نہاد اخلاقی معیارات کی بنیاد پر فحاشی اور عریاں نگاری سے تعبیر کیا گیا، حالانکہ ان کے فن کی تہیں انسانی روح کی اس سچائی کو تلاش کرتی ہیں جو مصلحتوں کے نقاب میں چھپی ہوتی ہے۔ نبیلہ عصمت اس تناظر میں منٹو کی بصیرت کا تجزیہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> "منٹو حقیقت کو کھلی آنکھ سے دیکھتا ہے اور لگی لپٹی رکھے بغیر اسے من و عن بیان کر دیتا ہے جس نے اسے متنازعہ ادیب بنا دیا ہے۔ وہ معاشرے کے ایسے افراد پر لکھتا ہے جن کے ذکر سے بھی نام نہاد شرفاء گھبراتے اور شرماتے ہیں۔ وہ عام زندگی میں انسانی عمل اور ردعمل کا مطالعہ کرتا ہے اور انسان کی باطنی سچائی اور نیکی پر یقین رکھتا ہے۔[1]"

منٹو کے فن کی تفہیم اور ان کے مرتبے کے تعین میں اردو کی نسائی تنقیدی و تخلیقی روایت کا کردار نہایت کلیدی رہا ہے۔ یہ ایک اہم تحقیقی پہلو ہے کہ جہاں منٹو کے ہم عصر مرد ناقدین کی بڑی تعداد ان کے فن کو 'منفیت' یا 'فسطائیت' کے خانوں میں تقسیم کرنے میں مصروف تھی، وہاں خواتین مصنفین نے غیر معمولی جرات اور علمی دیانت داری کے ساتھ منٹو کی میراث کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ ان کے فن کی ایسی تہوں کو دریافت کیا جو عام نقاد کی نظر سے اوجھل تھیں۔ خواتین قلم کاروں کے ہاں منٹو کا مطالعہ محض ایک ہم عصر ادیب کا مطالعہ نہیں ہے بلکہ یہ اس 'نسائی شعور' کا اظہار بھی ہے جو منٹو کے ہاں عورت کے مختلف روپوں (طوائف، ماں، بہن، بیٹی) میں چھپی انسانیت کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ان مباحث نے علمی دنیا میں یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح کر دی ہے کہ منٹو اور ان کا فن وقتی ہما ہمی کا شکار ہونے کے بجائے آفاقیت کے اس درجے پر فائز ہے جو آنے والی نسلوں کے لیے بھی فکری مشعلِ راہ رہے گا۔ منٹو کی تحریریں دراصل اس سیاسی اور سماجی بحران کا آئینہ ہیں جس میں 1947ء کی تقسیمِ ہند جیسا المیہ بھی شامل ہے، جہاں انسانی نقل مکانی اور سرحدوں کے آر پار بکھرتی زندگیوں کے دکھ کو منٹو نے "ٹوبہ ٹیک سنگھ" اور "کھول دو" جیسے شاہکار افسانوں میں ابدی کر دیا ہے۔

سعادت حسن منٹو کی ادبی زندگی تضادات، معاندانہ تنقید اور قانونی معرکہ آرائیوں کی ایک ایسی داستان ہے جس کی مثال اردو ادب میں کم ہی ملتی ہے۔ ان کے فن پر کیے جانے والے اعتراضات محض ادبی سطح تک محدود نہ تھے بلکہ انہیں اخلاقی اور سماجی بنیادوں پر بھی استرداد کا سامنا کرنا پڑا۔ منٹو پر بنیادی طور پر تین قسم کے اعتراضات کیے گئے: اول فحاشی اور عریانی کا الزام، دوم ان کے بیانیے میں چھپی گہری قنوطیت یا منفیت، اور سوم ان کے افسانوی ڈھانچے میں فنی ساخت کا فقدان۔ ناقدین کے ایک گروہ کا خیال تھا کہ منٹو محض ہیجان پیدا کرنے کے لیے جنسی بے راہ روی، عصمت فروشی اور معاشرے کے غلیظ طبقات کا انتخاب کرتے ہیں، جو روایتی اخلاقی قدروں کے منافی ہے۔

ان اعتراضات کی نوعیت کا علمی جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ منٹو کے ہاں جنس محض لذتیت کا ذریعہ نہیں تھی بلکہ وہ اسے ایک سماجی جبریت اور نفسیاتی سچائی کے طور پر دیکھتے تھے۔ سدرہ اختر، منٹو پر لگنے والے ان الزامات اور قانونی مقدمات کا دفاع کرتے ہوئے منٹو کی انفرادیت کو ان کے بے باکانہ اسلوب میں تلاش کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک منٹو کے جن افسانوں پر مقدمات چلے، ان میں حقیقت نگاری کے ایسے پیچیدہ زاویے موجود تھے جنہیں سمجھنے میں معاصر سماج ناکام رہا۔ وہ رقم طراز ہیں:

> "ان کی انفرادیت کا راز بے باکانہ انداز میں ہے... چھ افسانوں پر مقدمے بھی چلے جن میں 'دھواں'، 'بو'، 'کالی شلوار'، 'ٹھنڈا گوشت'، 'کھول دو' اور 'اوپر نیچے اور درمیان' شامل ہیں۔ ان میں حقیقت، فاشزم، فٹشزم اور سادیت پرستی کے ایسے عناصر موجود ہیں جن کی بنا پر بہت لے دے ہوئی۔ منٹو کے ہاں جنسیت کے موضوعات کی تکرار کے باوجود تنوع ملتا ہے۔"[2]

منٹو پر دوسرا بڑا اعتراض 'منفیت (Negativity)' کا تھا، جس کے تحت یہ استدلال پیش کیا گیا کہ ان کی کہانیاں زندگی کے صرف تاریک پہلوؤں، جیسے غربت، تشدد اور سماجی ناانصافی پر توجہ مرکوز کرتی ہیں اور ان میں امید یا رجائیت کا کوئی شائبہ نہیں ملتا۔ تاہم، نسائی تنقیدی نظر اس اعتراض کو مسترد کرتی ہے کہ منٹو مایوسی پھیلاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ منٹو نے معاشرے کے ناسوروں کو اس لیے بے نقاب کیا تاکہ ان کی اصلاح کی ضرورت کا احساس پیدا ہو۔ نبیلہ عصمت اس تناظر میں منٹو کی مصلحت سے پاک سچائی کو ان کے فن کا جوہر قرار دیتی ہیں۔ ان کے نزدیک منٹو کا 'گناہ' صرف یہ تھا کہ انہوں نے سماج کے ان کرداروں کو زبان دی جنہیں 'شرفاء' دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ وہ انسانی فطرت کے اس باطنی پہلو پر یقین رکھتے تھے جہاں بظاہر گناہ گار نظر آنے والے انسان کے اندر بھی نیکی کی کوئی رمق باقی ہوتی ہے۔

تیسرا اعتراض منٹو کی کہانیوں میں روایتی داستانی ساخت (Structure) کے فقدان کے حوالے سے اٹھایا گیا۔ کچھ ناقدین کا خیال تھا کہ ان کے افسانے بکھرے ہوئے اور قسط وار محسوس ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے ان میں فنی وحدت پیدا نہیں ہو پاتی۔ لیکن نسائی نقطۂ نظر سے اس اعتراض کا جواب یہ دیا گیا کہ منٹو نے روایتی پلاٹ سازی کے بجائے 'موضوعاتی شدت' کو اہمیت دی۔ ان کا اسلوب اس عہد کے بکھرے ہوئے سیاسی اور سماجی حالات کا عکاس تھا جہاں زندگی خود کسی منظم ساخت کی پابند نہیں رہی تھی۔ خواتین ناقدین نے یہ ثابت کیا کہ منٹو کے ہاں مواد اور فن اس طرح ہم آہنگ ہیں کہ ان کی کہانیوں کا تاثر دل و دماغ پر نقش ہو جاتا ہے۔ اس طرح نسائی تنقیدی روایت نے منٹو کے فن پر ہونے والے ان تمام اعتراضات کو علمی اور استدلالی بنیادوں پر رد کر کے ان کے فنی مقام کی از سرِ نو تعیین کی۔

سعادت حسن منٹو کی افسانہ نگاری کا ایک نہایت اہم اور روشن پہلو ان کا مخصوص 'صنفی شعور' ہے، جس نے اردو ادب میں نسائی کردار نگاری کے مروجہ اور فرسودہ تصورات کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ منٹو سے قبل اردو افسانے میں عورت یا تو ایک مثالی اور مافوق الفطرت پیکر کے طور پر نظر آتی تھی یا پھر اسے محض اخلاقی پستی کی علامت بنا کر پیش کیا جاتا تھا۔ منٹو نے ان دونوں انتہاؤں کے درمیان سے ایک ایسا راستہ نکالا جہاں عورت اپنے تمام تر گوشت پوست، نفسیاتی پیچیدگیوں، داخلی خواہشات اور انسانی جبلتوں کے ساتھ جیتی جاگتی نظر آتی ہے۔ ان کے ہاں نسائی کردار محض مردانہ تسلط کے تابع کوئی 'غیر فعال شے (Passive object)' نہیں ہیں بلکہ وہ اپنی انفرادی شناخت اور جنسی و سماجی وجود کا بھرپور احساس رکھتی ہیں۔ اردو کی ممتاز نقاد ممتاز شیریں نے منٹو کے اسی باغیانہ اور منفرد رویے کی نشاندہی کرتے ہوئے اسے اردو ادب کے لیے ایک سنگِ میل قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک منٹو نے ہندوستانی ادب میں رائج ان پدرانہ دقیانوسی تصورات (Patriarchal Stereotypes) کو چیلنج کیا جو عورت کو صرف مرد کی تسکین کا ذریعہ یا سماجی ضابطوں کی پابند ایک بے جان تصویر سمجھتے تھے۔ ممتاز شیریں اس بات کی قائل ہیں کہ منٹو کی عورت اپنی جنسی خواہشات اور ارادوں کے حوالے سے ایک واضح مؤقف رکھتی ہے، جو اس وقت کے معاشرے میں ایک انقلابی قدم تھا۔ وہ لکھتی ہیں:

> "منٹو کے ہاں عورت کا دوسرا روپ وہ ہے جس میں 'معصومیت' کی جگہ بے باکی نے لے لی ہے اور 'ترغیب'... نسوانی وجود کے اندر چھپی ہوئی وہ ان جانی غیر محسوس سی ترغیب... واضح و پر زور شہوانی اپیل بن گئی ہے... منٹو کی یہ عورت بڑی زور دار عورت ہے۔[3]"

منٹو کے ہاں عورت کا تصور طوائف کے کوٹھے سے شروع ہو کر ممتا کی آغوش تک وسیع نظر آتا ہے۔ ان کی نگاہ اس معاشرتی تضاد کو بخوبی بھانپ لیتی ہے جہاں ایک عورت کو 'طوائف' بنا کر دھتکار دیا جاتا ہے، مگر اس کے اندر کی 'عورت'، 'بیوی' اور 'ماں' مرنے نہیں پاتی۔ ڈاکٹر روبینہ شاہجہان نے منٹو کے اس انسانی رویے کی تفہیم کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ منٹو نے عورت کے انسانی حقوق اور اس کے باطنی وجود کی سچائی کو ہمیشہ مقدم رکھا۔ ان کے نزدیک منٹو کے ہاں جہاں بعض سفاک اور بے درد عورتیں ملتی ہیں، وہیں ممی، سوگندھی اور زینت جیسے کردار بھی ہیں جو معاشرے کی غلاظت کے درمیان 'کیچڑ میں کھلے کنول' کی طرح اپنی پاکیزگی برقرار رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر روبینہ شاہجہان کے بقول:

> "منٹو نے عورت کے انسانی حقوق کا بے حد خیال رکھا ہے... ان کے افسانوں میں عورت ایک طوائف ہے اور طوائف بننے کے باوجود جس میں عورت مری نہیں بلکہ الگ الگ روپ میں زندہ ہے۔ اس روپ میں وہ بیوی بننا چاہتی ہے اور ماں بھی۔ یہ منٹو کی دلچسپی کا میدان ہے اور وہ پلٹ پلٹ کر ادھر آتے ہیں۔[4]"

اس طرح منٹو نے نسائی کرداروں کی درجہ بندی میں لگے لپٹے اخلاقی پیمانوں کو توڑ کر ایک نئے انسانی تناظر کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے ثابت کیا کہ عورت محض ایک جسم نہیں بلکہ ایک مکمل سماجی اور نفسیاتی اکائی ہے، جس کے دکھ، سکھ اور جبلتیں سماج کے بنائے ہوئے مصنوعی

خانوں سے کہیں زیادہ وسیع اور حقیقی ہیں۔ منٹو کا یہ صنفی شعور اردو کی نسائی تنقیدی روایت میں اس لیے بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے عورت کو اس کی اصل انسانی شکل میں پیش کرنے کی وہ جرات دکھائی جو ان کے ہم عصروں کے ہاں مفقود تھی۔

اردو میں منٹو شناسی کی روایت اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک اس میں عصمت چغتائی اور ممتاز شیریں کے تنقیدی و توصیفی زاویوں کو شامل نہ کیا جائے۔ یہ دونوں خواتین منٹو کی معاصر تھیں، مگر ان دونوں کا نقطہ نظر ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہوئے بھی منٹو کے فن کی تفہیم میں نہایت معاون ثابت ہوا۔ عصمت چغتائی کا تعلق منٹو سے ایک گہری دوستی اور فکری ہم آہنگی کا تھا، جبکہ ممتاز شیریں نے منٹو کے فن کا علمی، تقابلی اور فنی بنیادوں پر محاکمہ کیا۔ عصمت چغتائی منٹو کی عظمت کی اس لیے قائل تھیں کیونکہ انہیں منٹو کی شخصیت اور فن میں ایک ایسی ہمہ گیریت نظر آتی تھی جو ذہنی جالا صاف کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ وہ منٹو کے ساتھ اپنی فکری وابستگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"میں اور منٹو اگر پانچ منٹ کے ارادے سے بھی ملتے تو پانچ گھنٹے کا پروگرام ہو جاتا۔ منٹو سے بحث کر کے ایسا معلوم ہوتا جیسے ذہنی قوتوں پر دھار رکھی جا رہی ہے۔ جالا صاف ہو رہا ہے۔[5]"

عصمت چغتائی نے منٹو پر لگنے والے فحاشی کے الزامات کا دفاع نہایت منفرد انداز میں کیا۔ ان کے نزدیک منٹو کا بیانیہ گندہ یا بیہودہ نہیں تھا، بلکہ اس میں ایک ایسی معصومیت اور بھولپن تھا کہ قاری کو گھن یا غصے کے بجائے انسانی فطرت پر ہنسی آ جاتی تھی۔ وہ منٹو کو ایک ایسے "واقعہ نگار" کے طور پر دیکھتی تھیں جس نے معاشرتی تضادات کو ایک جراحت کار کی طرح چیر کر رکھ دیا تھا۔ عصمت کے نزدیک منٹو کے کردار محض افسانوی خاکے نہیں بلکہ گوشت پوست کے زندہ انسان تھے، جن میں برائی کے درمیان بھی نسوانیت کی کوئی رگ پھڑکتی نظر آتی تھی۔ لاہور کی عدالت میں فحاشی کے مقدمے کے دوران ان دونوں کی رفاقت اس فکری جرات کی عکاسی کرتی ہے جہاں منٹو اس الزام کو اپنے لیے ایک "اعزاز" تصور کرتے تھے۔ عصمت لکھتی ہیں:

"منٹو کے فون سے معلوم ہوا، ان پر بھی مقدمہ چلا ہے اسی کورٹ میں اسی روز ان کی بھی پیشی ہے... منٹو نہایت شاش بشاش، جیسے کسی نے وکٹوریہ کراس دے دیا ہو۔ میں دل میں بڑی نادم تھی... دل میں تو دھکڑ پکڑ ہو رہی تھی مگر منٹو نے وہ شہ دی کہ میرا بھی ڈر نکل گیا۔[6]"

دوسری طرف، ممتاز شیریں نے منٹو کے فن کا زیادہ منظم اور علمی تجزیہ پیش کیا۔ انہوں نے منٹو کو اردو کا "موپاساں" قرار دیا اور یہ ثابت کیا کہ منٹو کی بغاوت دراصل "فطری انسان" کی آزادی کی پکار ہے۔ ممتاز شیریں کا استدلال تھا کہ منٹو کی تحریریں آنے والے وقتوں میں بھی اپنی معنویت برقرار رکھیں گی کیونکہ وہ مروّجہ اخلاقی قدروں کے بجائے انسانی جبلتوں کی سچائی پر مبنی ہیں۔ انہوں نے منٹو کو ایک "اخلاقی فنکار" ثابت کرتے ہوئے فحاشی کے الزامات کو سختی سے مسترد کیا۔ ان کے خیال میں منٹو کی تحریریں جنس نگار ادیبوں میں سب سے زیادہ صاف ستھری تھیں کیونکہ ان میں لذتیت کے بجائے ایک جرات مندانہ صداقت موجود تھی۔ وہ منٹو کے فنی اخلاص کا اعتراف ان الفاظ میں کرتی ہیں:

"منٹو ایک سچا، دیانت دار، فطری فن کار تھا اس نے جو کچھ لکھا، بھرپور خلوص اور ایمانداری سے لکھا۔ منٹو میں اظہار کی مسلسل تڑپ تھی، ایک شدید اندرونی لگن، ایک آگ جس میں وہ ہمیشہ تپتا رہتا تھا... زندگی کے مشاہدے اور تجربے میں منٹو نے اپنے آپ کو موم شمع کی طرح پگھلایا۔[7]"

ممتاز شیریں نے منٹو کے افسانوی ڈھانچے اور مرکزی تصورات کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ منٹو نے کسی کی پیروی نہیں کی، بلکہ وہ خود اپنی ذات میں ایک دبستان تھے۔ ان کے نزدیک منٹو اور موپاساں کی مطابقت محض اتفاقی نہیں بلکہ دونوں کے نظریہ حیات

اور فنی تشکیل میں گہرا ربط پایا جاتا ہے۔ عصمت چغتائی کی جذباتی و فکری رفاقت اور ممتاز شیریں کے عالمانہ تجزیوں نے مل کر منٹو کے فن کو ایک ایسی توانا بنیاد فراہم کی، جس نے معاصر مرد ناقدین کے منفی پروپیگنڈے کا رخ موڑ دیا۔

سعادت حسن منٹو کے فن کا ایک نمایاں وصف ان کا اسلوب ہے، جو وقت کے ساتھ ساتھ مختلف ارتقائی منازل طے کرتا ہوا ایک ایسی انفرادی شناخت اختیار کر لیتا ہے جس کی مثال اردو نثر میں نہیں ملتی۔ منٹو کے ہاں اسلوب محض اظہار کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک ایسا جراحت کارانہ آلہ ہے جس سے وہ سماج کے چھپے ہوئے ناسوروں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ فرزانہ اسلم نے منٹو کے اسی اسلوبیاتی تنوع اور انفرادیت کو ان کے فن کا بنیادی رنگ قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک منٹو کا موضوعاتی کینوس اس قدر وسیع ہے کہ وہ ہر اس چیز کو افسانے کی گرفت میں لے آتے ہیں جس میں کوئی نیا پن یا تیکھا پن موجود ہو۔ وہ رقم طراز ہیں: "منٹو کے افسانوں کا موضوع ہر وہ چیز ہو سکتی ہے جس میں کوئی نیا پن اور کوئی تیکھا پن ہو۔ منٹو کا اپنا ایک منفرد انداز ہے، منٹو کا اپنا ایک الگ رنگ ہے۔[8]"

منٹو کے اسلوب کے ارتقائی مطالعے میں ڈاکٹر طاہرہ اقبال کا کام خاصی اہمیت کا حامل ہے، جنہوں نے روایتی جذباتی تنقید کے بجائے "متن مرکوز مطالعہ کے ذریعے منٹو کے فنی سفر کو تین واضح ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ ان کے نزدیک منٹو کے پہلے دور کے افسانے ایک ایسے فنکار کی تخلیقات ہیں جو خوابیدہ معاشرے کو جھنجھوڑنے کی تڑپ رکھتا ہے، مگر ابھی اس کے ہاں فن کی طنابیں پوری طرح کسی نہیں گئیں۔ طاہرہ اقبال پہلے دور کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> "منٹو ایک اونگھتے ہوئے معاشرے کو جگانا چاہتے تھے، جھنجھوڑنا چاہتے تھے۔ اپنے مقصد کی بے تابی اس کے اسلوب کی بے چینی بن جاتی ہے۔ ابھی مقصد کی شدت کو فن کی طنابوں میں کسنے کا فن کچا ہے۔ یہاں کہانی اکہرے پلاٹ اور یک رخے اسلوب کی حامل ہے۔[9]"

دوسرے دور تک پہنچتے پہنچتے منٹو کے ہاں فنی پختگی اور سماجی تفہیم اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ اس دور میں منٹو نے اپنے لیے ایک نئی لسانی راہ نکالی، جہاں وہ لفظوں کی کیمیائی تبدیلی کے ذریعے مناظر اور کرداروں کی عکاسی کرتے ہیں۔ طاہرہ اقبال کے بقول، منٹو نے اپنے اسلوب کے تار و پود خود بنے اور جملوں کی ایسی ساخت وضع کی جو ان کے عہد میں ان کی پہچان بنی۔ ان کے نزدیک منٹو نے افسانوی فن میں ایک ایسی سادہ مگر متجسس نثر پیدا کی جو قاری کو بیانیے کے ساتھ بہالے جاتی ہے۔

تیسرے دور میں، جس پر تقسیمِ ہند کے فسادات کی چھاپ بہت گہری ہے، منٹو کا اسلوب مزید گہرا اور رمزیہ ہو جاتا ہے۔ یہاں وہ ظلم اور مظلومیت کے مابین انسانیت کے ان ذرات کو تلاش کرتے ہیں جو عام آنکھ سے اوجھل رہ جاتے ہیں۔ طاہرہ اقبال لکھتی ہیں:

> "ظلم اور مظلومیت کے درمیان بھی بہت کچھ ہوتا ہے، جسے منٹو نے جستہ جستہ چن لیا ہے، جیسے نیاگر ریت کے ڈھیر میں سے سونے کے ذرات چن لیتا ہے، اسی طرح منٹو بہت سے میں سے کام اور مطلب کی اشیاء تلاش کر لیتا ہے اور پھر ان کو جو گھڑت دیتا ہے ان پر منٹو کی ہی چھاپ لگی ہوتی ہے۔[10]"

منٹو کے اسلوبیاتی مطالعے میں یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ انہوں نے افسانوی فن کی حرمت کو برقرار رکھتے ہوئے مواد اور فن کا ایک ایسا حسین امتزاج پیدا کیا کہ ان کی کہانیاں براہِ راست دل میں پیوست ہو جاتی ہیں۔ فرزانہ اسلم کے نزدیک منٹو نے تکنیکی تجربات کے باوجود افسانے کی بنیادی روح کو مجروح نہیں ہونے دیا، یہی وجہ ہے کہ ان کا اسلوب آج بھی جدید افسانہ نگاروں کے لیے قابلِ تقلید ہے۔ منٹو کی نثر کی یہی سادگی، روانی اور معنوی گہرائی انہیں اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے اور ان کے فن کو آفاقیت عطاء کرتی ہے۔

سعادت حسن منٹو کے افسانوی سفر کا سب سے المیہ اور فکر انگیز باب 1947ء کی تقسیمِ ہند اور اس کے نتیجے میں رونما ہونے والے فسادات ہیں۔ منٹو نے تقسیم کے اس عہد ساز المیے کو محض ایک سیاسی واقعے کے طور پر نہیں دیکھا، بلکہ اسے انسانیت کی تذلیل اور اخلاقی قدروں کے زوال کے تناظر میں پرکھا ہے۔ جہاں مؤرخین نے تقسیم کو اعداد و شمار اور سیاسی جغرافیے کی تبدیلی سے تعبیر کیا، وہاں منٹو نے اس 'انسانی قیمت' کا نوحہ لکھا جو برصغیر کے عام آدمی نے اپنی جان، مال اور آبرو کی صورت میں ادا کی۔ معروف مؤرخ عائشہ جلال نے منٹو کی ان تحریروں کو محض ادب کے بجائے ایک ایسی 'تاریخی گواہی' قرار دیا ہے جو تقسیم کے صدمے سے گزرنے والوں کے تجربات کی حقیقی بصیرت فراہم کرتی ہے۔ ان کے نزدیک منٹو کا جرات مندانہ اسلوب انہیں ان بلندیوں پر لے گیا جہاں سرکاری تاریخ کے بیانیے بھی نہیں پہنچ سکتے تھے۔ عائشہ جلال رقم طراز ہیں:

> "منٹو کا جرات مندانہ انداز جس میں انہوں نے روزمرہ زندگی سے وابستہ عام آدمی، طوائفوں، دلالوں اور جرائم پیشہ افراد کی کہانیاں بیان کر کے انہیں شہرت کی ان بلندیوں پر پہنچا دیا جو سرکاری سرپرستی سے بھی انہیں حاصل نہیں ہو سکتی تھیں... منٹو نے سماجی مسائل کے حل کے لیے مصلحت پسندی کی بجائے ہمیشہ حق گوئی کا ساتھ دیا۔[11]"

منٹو کے فسادات سے متعلق افسانے، مثلاً "ٹوبہ ٹیک سنگھ" اور "کھول دو" محض کہانیاں نہیں ہیں بلکہ اس دور کی وحشت اور بربریت کا نوحہ ہیں۔ عائشہ جلال کے مطابق کوئی بھی مؤرخ 1947ء کے فسادات کی وہ منطقی توجیہ پیش نہیں کر سکتا جو منٹو کی تحریروں میں نظر آتی ہے۔ منٹو نے یہ دکھایا کہ صدیوں سے ساتھ رہنے والے انسان اچانک ایک دوسرے کے خون کے پیاسے کیوں بن گئے۔ ان کے نزدیک یہ مذہبی جنون نہیں بلکہ انسانی جبلتوں میں چھپی درندگی اور حرص و ہوس تھی جس نے برصغیر کو اس افسوسناک صورت حال تک پہنچایا۔ عائشہ جلال اس حوالے سے منٹو کے منفرد نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> "1947ء میں جو تشدد اور جو بربریت اس نے دیکھی اور اس کے بہت دیر تک رہنے والے اثرات کا مشاہدہ کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ مذہبی جوش و خروش اور زہد و تقویٰ نہیں ہے بلکہ یہ محض انسانی حرص و ہوس اور درندہ بن جانے کی ان کی حیرت انگیز صلاحیت ہے جس نے برصغیر کو اس افسوسناک صورت حال تک پہنچایا ہے۔[12]"

منٹو کی اس تخلیقی بصیرت میں جہاں مقامی المیے کا ذکر ملتا ہے، وہیں ان کا شعور ایک آفاقی جہت بھی اختیار کر لیتا ہے۔ روبینہ یاسمین نے منٹو کے تقسیم سے متعلق افسانوں کا تجزیہ کرتے ہوئے اسی آفاقیت کی نشاندہی کی ہے۔ ان کے نزدیک منٹو نے اپنے عہد کے سیاسی حالات و واقعات سے جو کچھ اخذ کیا، اسے افسانوی رنگ دے کر ابدی سچائیوں میں بدل دیا۔ وہ لکھتی ہیں: "منٹو نے اپنے دور کے سیاسی حالات و واقعات سے جو کچھ اخذ کیا اسے افسانوی شکل میں ہمارے سامنے پیش کر دیا۔ لیکن منٹو کی سوچ اور شعور آفاقی تھا۔[13]"

منٹو نے تقسیم کے دوران جہاں تشدد کا ارتکاب کرنے والوں کی نفسیات کو آشکار کیا، وہیں تشدد کے شکار لوگوں کے دکھ کو بھی پوری شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ ان کا قلم کسی ایک مذہب یا فرقے کی جانبداری کے بجائے محض 'انسانیت' کا علمبردار رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیاں آج بھی قارئین کو اسی طرح متاثر کرتی ہیں اور تقسیمِ ہند کے مطالعے کے لیے ایک ناگزیر تاریخی و ادبی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

سعادت حسن منٹو کی ادبی میراث کی تفہیم اور اسے معاصر عہد کے فکری تناظر میں دیکھنے کے حوالے سے جدید نسائی تنقید کا کردار نہایت کلیدی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ دورِ حاضر کی خواتین ناقدین نے منٹو کے فن کو محض ماضی کے ایک یادگار کے طور پر نہیں دیکھا، بلکہ اسے سماجی انصاف، انسانی حقوق اور صنفی مساوات کے لیے جاری جدوجہد کے ایک توانا استعارے کے طور پر پیش کیا ہے۔ ممتاز نقاد اور افسانہ نگار نگار عظیم نے منٹو کے فکر و فن کا مطالعہ کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ منٹو کی کہانیاں اپنی وسعت اور تنوع کی بنا پر آج بھی قارئین کے لیے

اتنی ہی مؤثر ہیں جتنی اپنے عہد میں تھیں۔ ان کے نزدیک منٹو کا اصل کمال یہ ہے کہ انہوں نے انسانی فطرت پر چڑھے ہوئے نمود و نمائش اور مصلحت کے مصنوعی خول کو اُتار کر اس کی اصلیت کو بے نقاب کر دیا ہے۔ نگار عظیم منٹو کے افسانوی کینوس کی ہمہ گیری کا اعتراف ان الفاظ میں کرتی ہیں: "منٹو کا افسانوی فن کسی ایک خوبی تک محدود نہیں ہے اس کے موضوعات اور کردار کا کینوس بہت وسیع ہے۔[14]"

جدید نسائی تنقید کے اس سلسلے میں نبیلہ عصمت کا نام بھی نمایاں ہے، جنہوں نے منٹو کے افسانوں کی "عصری پڑھت" کے ذریعے ان کے نسائی کرداروں کی پیچیدگیوں کو آشکار کیا ہے۔ ان کا استدلال ہے کہ منٹو کے ہاں عورت کے کردار کسی مخصوص طبقے یا روایتی سانچے میں قید نہیں ہیں، بلکہ وہ اپنی خواہشات اور وجود کا بھرپور احساس رکھتے ہیں۔ نبیلہ عصمت منٹو کو ایک ایسا "تلخ حقیقت پسند" قرار دیتی ہیں جو معاشرے کو سدھارنے کا دعویٰ کرنے کے بجائے اسے اس کے اصل روپ میں دکھانے کو ترجیح دیتا ہے۔ وہ منٹو کے مشاہدے کی گہرائی اور اس کے تخلیقی ردعمل کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> "منٹو حقیقت پسند ہے، ایک تلخ حقیقت پسند۔ وہ معاشرے کے لوگوں کو اور لوگوں کے رویوں کو ویسا ہی دکھاتا ہے جیسے وہ ہیں۔ وہ معاشرے کو سدھارنے کی کوشش نہیں کرتا اور نہ ہی اس کو اس بات سے کوئی غرض ہے کہ معاشرے کو کیسا ہونا چاہیے، بلکہ وہ خاموشی سے اپنے اردگرد رونما ہونے والے واقعات کو دیکھتا ہے اور ایک خاموش مگر نہایت زہریلی مسکان اس کے چہرے پر آجاتی ہے اور وہ اس زہر کو کاغذ پر اتار کر شانت ہو جاتا ہے۔[15]"

منٹو کی معاصر معنویت اس حوالے سے بھی اہم ہے کہ انہوں نے جن سماجی تضادات اور جنسی و نفسیاتی گرہوں کی نشاندہی کی تھی، وہ آج کے پیچیدہ سماج میں مزید سنگین صورت اختیار کر چکی ہیں۔ جدید خواتین ناقدین نے یہ ثابت کیا ہے کہ منٹو نے جن "ممنوع موضوعات" پر قلم اُٹھایا تھا، وہ دراصل انسانی حقوق کی پامالی اور سماجی جبر کی مختلف صورتیں تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ منٹو کا فن آج بھی نئی نسل کے مصنفین اور ناقدین کے لیے ایک فکری اساس فراہم کرتا ہے۔ ان خواتین لکھاریوں کی کاوشوں نے یہ بات یقینی بنا دی ہے کہ منٹو کی فنی اور فکری مہارت کو محض "متنازعہ" کہہ کر رد نہیں کیا جا سکتا، بلکہ یہ اردو ادب کا وہ بیش قیمت اثاثہ ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنی اہمیت اور اثر پذیری میں اضافہ کرتا رہے گا۔

تمام مباحث اور تجزیاتی مطالعے کی روشنی میں یہ حقیقت نکھر کر سامنے آتی ہے کہ سعادت حسن منٹو کے فن کی بقا اور ان کے ادبی مرتبے کے استحکام میں اردو کی نسائی تنقیدی روایت کا کردار محض دفاعی نہیں بلکہ اساسی رہا ہے۔ منٹو کے فن پر ہونے والے اعتراضات، چاہے وہ فحاشی کے الزامات ہوں یا منفیت اور فنی ساخت کے فقدان کے دعوے، خواتین ناقدین نے ان کا جواب محض جذباتی وابستگی سے نہیں بلکہ ٹھوس علمی اور استدلالی بنیادوں پر فراہم کیا۔ عصمت چغتائی کی فکری رفاقت سے لے کر ممتاز شیریں کے عالمانہ تقابلی جائزے تک اور جدید دور میں طاہرہ اقبال، عائشہ جلال اور نگار عظیم کی معروضی تشریحات تک، اس روایت نے منٹو کو ایک "متنازعہ افسانہ نگار" کے خانے سے نکال کر ایک "آفاقی انسان دوست فنکار" کے منصب پر فائز کیا۔

اس تحقیقی مطالعے کے حاصلات (Findings) کو درج ذیل نکات میں سمیٹا جا سکتا ہے:

اولاً، نسائی تنقیدی روایت نے یہ ثابت کیا کہ منٹو کے ہاں جنسیت محض لذتیت کا ذریعہ نہیں تھی بلکہ یہ انسانی نفسیات اور سماجی جبر کی وہ سچائی تھی جسے پدرانہ سماج کے منافقانہ اخلاق نے چھپا رکھا تھا۔ خواتین ناقدین نے منٹو کے نسائی کرداروں میں "عورت" کی اس بقا کو دریافت کیا جو طوائف کے روپ میں بھی اپنی ممتا، وفا اور پاکیزگی کو بچائے رکھتی ہے۔ ثانیاً، فنی سطح پر یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ منٹو کا اسلوب وقت کے ساتھ ارتقائی منازل طے کرتا ہوا ایک ایسی تجریدی اور رمزیہ کیفیت اختیار کر لیتا ہے جو تقسیمِ ہند جیسے ہولناک المیے کو بیان کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا

ہے۔ ثالثاً، یہ مطالعہ اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے کہ منٹو کی تحریریں تاریخ کے ایک ایسے گواہ کے طور پر تسلیم کی جانی چاہئیں جو سرکاری دستاویزات سے کہیں زیادہ معتبر ہیں، کیونکہ ان میں اعداد و شمار کے بجائے انسانی کرب کی سچی تصویریں موجود ہیں۔

آخر میں یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ منٹو اور اردو کی خواتین مصنفین کے درمیان ایک ایسا فکری اور فنی رشتہ موجود ہے جس نے اردو ادب میں "انسان" کی تفہیم کے نئے در وا کیے ہیں۔ منٹو کی میراث آج بھی اگر زندہ ہے اور قارئین کو متاثر کر رہی ہے، تو اس میں ان خواتین قلم کاروں کا بڑا حصہ ہے جنہوں نے منٹو کے فن کی تہوں میں چھپے ہوئے اس "فطری انسان" کو پہچانا جو خیر و شر کے روایتی تصورات سے ماورا اپنی جبلتوں میں سچا تھا۔ یہ مقالہ اس امر کی تائید کرتا ہے کہ منٹو شناسی کی تاریخ نسائی تنقیدی روایت کے ذکر کے بغیر نہ صرف ادھوری ہے بلکہ ان کی آفاقیت کی تفہیم بھی اس کے بغیر ناممکن ہے۔ منٹو کی فنی اور فکری مہارت آنے والی نسلوں کے لیے بھی ایک ایسی مشعلِ راہ رہے گی جو ادب میں صداقت، جرات اور انسانیت کی اقدار کو مستحکم کرتی رہے گی۔

حوالہ جات:

[1] نبیلہ عصمت، **سعادت حسن منٹو اور غلام عباس**، (لاہور: فکشن ہاؤس، 2020ء)، ص9-

[2] سدرہ اختر، **اردو افسانے میں جنس کی روایت**، (اسلام آباد: پورب اکادمی، جنوری 2018ء)، ص27-

[3] ممتاز شیریں، **منٹو نوری نہ ناری**، مرتب آصف فرخی، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، طبع دوم 2018ء)، ص77-

[4] روبینہ شاہجہاں، ڈاکٹر، **بابو گوپی ناتھ: زندگی کے امکانات کا اشارہ**، مشمولہ منٹو کون ہے یہ گستاخ..؟ مرتبہ ڈاکٹر سید عامر سہیل، (لاہور: پاکستان رائٹرز کوا پریٹو سوسائٹی، طبع اول 2015ء)، ص219-

[5] عصمت چغتائی، **میرا دوست میرا دشمن**، مشمولہ: سعادت حسن منٹو (منٹو صدی: منتخب مضامین)، مرتبین مبین مرزا، رؤف پاریکھ، ڈاکٹر، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، طبع اول 2011ء)، ص36-

[6] عصمت چغتائی، **کاغذی ہے پیرہن**، (لاہور: الحمد پبلی کیشنز 2015ء)، ص43-

[7] ممتاز شیریں، **منٹو نوری نہ ناری**، مرتب آصف فرخی، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، طبع دوم 2018ء)، ص157-

[8] فرزانہ اسلم، ڈاکٹر، **سعادت حسن منٹو حیات اور افسانے**، (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، اشاعت اول 2009ء)، ص66-

[9] طاہرہ اقبال، **منٹو کا اسلوب**، (لاہور: فکشن ہاؤس، اشاعت دوم 2017ء)، ص95-

[10] طاہرہ اقبال، **منٹو کا اسلوب**، (لاہور: فکشن ہاؤس، اشاعت دوم 2017ء)، ص122-

[11] عائشہ جلال، **منٹو صدی** 1912-2012 (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2012ء)، ص1-2-

[12] عائشہ جلال، "**ایک کھوکھلے ضمیر کا نگہبان**"، مشمولہ: سہ ماہی دہلیز-4-3 (جموں کشمیر: وارڈ نمبر 2 آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن پونچھ، سن اشاعت ندارد)، 51/4-

[13] روبینہ یاسمین، **منٹو کا سیاسی شعور**، (فیصل آباد: مثال پبلشرز، 2012ء)، ص81-

[14] نگار عظیم، **منٹو کا سرمایہ فکر و فن**، (نئی دہلی: بزم ہم قلم 2002ء)، ص25-

[15] نبیلہ عصمت، **سعادت حسن منٹو اور غلام عباس**، (لاہور: فکشن ہاؤس 2020ء)، ص14-